© rasailojaraid.com

بحث و نظر

مسلمان باپ کی ذمہ داریاں

مولانا صدر الدین اصلاحی

مسلمان کی بنیادی ذمہ داریاں

مسلمان بحیثیت مسلمان، جو ذمہ داریاں اپنے سر رکھتا ہے، ان کو اگر اصولی طور سے تقسیم کیا جائے تو وہ کل تین قسموں کی نظر آئیں گی۔ ان میں سے ایک کا تعلق تو تمام تر اس کی اپنی ذات سے ہوگا، دوسری کا اس کے اپنے اہل و عیال سے ہوگا، اور تیسری کا تعلق باقی انسانوں سے ہوگا۔ پہلی دو ذمہ داریوں کا تعین یہ ارشادِ الٰہی کرتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا... الخ (التحریم - ۶)

اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (جہنم کی) آگ سے ... الخ۔

اور تیسری کی وضاحت یہ آیتِ کریمہ کرتی ہے:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۱۰)

تم وہ بہترین گروہِ انسانی ہو جو لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم (انھیں) بھلائی کا حکم دیتے ہو۔ برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

جہاں تک پہلی ذمہ داری کا سوال ہے، وہ سب سے مقدم بھی ہے سب سے اہم بھی ہے، اور سب سے بڑی اور بھاری بھی، کیونکہ اس کا ادا ہو سکنا اپنی استطاعت کی حد تک اُن سارے ہی فرائض و ہدایات کی انجام دہی پر موقوف ہے جن کے مجموعے کا نام دین اور شریعت ہے، یا قرآن و حدیث۔

دوسری ذمہ داری بھی ایک زبردست اور خاص اہمیت کی مالک ہے۔ اللہ رب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

العالمین نے اہل ایمان کو جس طرح اس امر کی تلقین کی ہے کہ "اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ" اسی طرح، ساتھ کے ساتھ، اس بات کی بھی تاکید کر رکھی ہے کہ "اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ"! آیت کا یہ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ ان دونوں ذمہ داریوں میں عملاً تفریق نہیں کی جا سکتی۔ پہلی کو اولیت ضرور حاصل ہے اور وہ اہم تر بھی ہے، پھر اس کی بجا آوری ہر حال میں لازمی اور ناگزیر بھی ہے، لیکن دوسری کو بھی کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اسے نظر انداز کر دیا گیا تو پہلی سے بھی آدمی عہدہ بر آ نہیں قرار پا سکتا، خواہ اس کے لیے اس نے کتنی ہی ریاضتیں اور مجاہدے کر ڈالے ہوں۔

تیسری ذمہ داری بھی اپنی جگہ ایک عظیم اور بہت آزما ذمہ داری ہے، اور اسے ادا کیے بغیر ایک مسلمان کا واقعی معنوں میں مسلمان کی حیثیت سے، جانا پہچانا جانا مشکل ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن حکیم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اہلِ ایمان کی ایک لازمی صفت اور ضروری علامت قرار دیا ہے، اللہ کے رسولؐ نے اس صفت کی غیر موجودگی کو ایمان سے بے بہرہ ہونے کا ثبوت بتایا ہے، اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ معبود برحق نے امت مسلمہ کے وجود کی غرض وغایت ہی اسی کام کو فرمایا ہے۔ اگر مقصد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ذمہ داری بھی فی الواقع باقی دونوں ذمہ داریوں جیسی ایک ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اس کا مدعا بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال ہی کی طرح دوسرے بندگانِ خدا کو بھی نارِ جہنم سے بچانے کی کوشش کیے جائے اور مسلسل کی جاتی رہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا مقام پہلی دونوں ذمہ داریوں کے بعد آتا ہے، مگر آتا بہر حال ہے اور بالکل غیر منفک طور سے آتا ہے، ایسے لزوم کے ساتھ آتا ہے کہ اسے انجام دیے بغیر خود اپنی ذات کو بھی آخرت کی تباہی سے نہیں بچایا جا سکتا۔

اس طرح یہ کہنا چاہیے کہ یہ تینوں ذمہ داریاں الگ الگ تین ہونے کے باوجود فی الواقع ایک ہی ہیں، یعنی ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں، باہم مربوط اور پیوستہ۔ اور یہ پورا سلسلہ ہی اس فریضے کے پورے مفہوم کی صورت گری کرتا ہے جسے انجام دینے کو 'اسلام' اور انجام دینے والے کو 'مسلمان' کہا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

'مسلم تاریخ' کے بنانے والے عوامل جو بھی رہے ہوں، لیکن جہاں تک 'اسلامی تاریخ' کا تعلق ہے، اس کی تشکیل ہمیشہ سے یہی تینوں چیزیں کرتی رہی ہیں، آج بھی کر رہی ہیں، اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ اس لیے پوری طرح نہ اسلام کو سمجھا جاسکتا ہے نہ صحیح معنوں میں مسلمان کو جانا پہچانا جاسکتا ہے، نہ ٹھیک طور سے 'اسلامی تاریخ' سے شناسائی حاصل کی جاسکتی ہے جب تک مسلمان کی ان تینوں بنیادی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ آئیے اس وقت درمیانی کڑی کو لے لیں اور ذرا تفصیل سے یہ معلوم کرلیں کہ ایک مسلمان پر اس کے اپنے بچوں کے بارے میں جو بنیادی ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ کیا معنی رکھتی ہے اور کس طرح ادا کی جاسکتی ہے؟ زیادہ صاف اور سادہ لفظوں میں یہ کہ 'مسلمان باپ' کیسا ہوتا ہے، اور اپنے بچوں کے بارے میں اس کی اصل فکر اور سب سے مقدم کوشش کیا رہتی ہے یا کیا رہنی چاہیے؟

ایک اصولی حقیقت

اس بحث کی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک اصولی حقیقت کا جان اور سمجھ لینا مناسب رہے گا:۔

دنیا کا ہر بامقصد گروہ، جو اپنے مقصد اور نصب العین کا واضح تصور رکھتا ہو اور اس کے بارے میں سنجیدہ اور مخلص بھی ہو، اس بات پر کڑی نظر رکھتا ہے اور اس کے لیے ہر ممکن اہتمام بھی کرتا ہے کہ اس کی صفوں میں نئے داخل ہونے والے افراد اس نصب العین کے سچے شناسا اور اس کے مخلص کارکن ثابت ہوں ان کا ذہن اس مقصد کے لیے بالکل یکسو، ان کے جذبات اس سے پوری طرح سرشار، اور ان کی توانائیاں اس کی بقاء و ترقی کی خاطر کی جانے والی جد وجہد پر اچھی طرح مرکوز ہیں اور یہ بالکل فطری بات ہے۔ ایسا ہونا ہی چاہیے۔ اس بارے میں زیادہ حساس، پرجوش اور مقصد کے دھنی لوگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسل کے دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اس کے تئیں اپنی مساعی اور تدابیر کا آغاز کر دیتے ہیں۔ نازی جرمنی کی واضح ترین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثال ابھی کل کی بات ہے۔ اس کے ہاں ماں بننے والی خواتین کے ذہنوں کو اور ان کے افکار و خیالات اور جذبات کو نازی ازم کی تیز تیز خوراکیں دی جاتیں، تاکہ ان کی ذہنی اور فکری لہروں میں یہ فلسفۂ حیات سرایت کر جائے اور پھر ان کے اندر پروان چڑھنے والے جنینوں کے زیر تشکیل لاشعور میں پہلے دن سے اس کا انعکاس شروع ہو جائے۔ اس کا یہ طرزِ عمل یقیناً اس کے اخلاص فی المقصد کا ایک مثالی مظہر تھا۔ نازی ازم کا نظریہ خواہ کتنا ہی غلط رہا ہو، مگر اس کی تعمیر و ترقی کے لیے جرمنی نے جو تدبیر اختیار کی تھی اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اسلام نے بھی اس بارے میں کچھ کم دور نگاہی سے کام نہیں لیا ہے۔ اس نے جہاں یہ چاہا ہے کہ مسلمان اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا کر اٹھائیں، وہیں اس کے لیے اس نے انھیں ایسی تدبیروں کی بھی تلقین کر رکھی ہے جن کا سلسلہ اولاد کے آغازِ وجود سے بھی پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو ذرا غور سے سنیے:

إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا۔

(ابو داؤد، جلد اول۔ باب فی جامع النکاح)

جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو پہلے بسم اللہ پڑھ کر یہ دعا کرے کہ خدایا ہم دونوں کو شیطان (کے شر) سے محفوظ رکھ، اور ہماری اس اولاد سے بھی شیطان کو دور رکھیو جو تمہیں عطا فرمائے۔

اس کے بعد حضورؐ کے اس عمل کو بھی، جو دراصل سارے مسلمانوں کے لیے آپؐ کی ایک واجب الاتباع سنت کی حیثیت رکھتا ہے، سامنے رکھیے:

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَذَّنَ فِيْ اُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ حِيْنَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلٰوةِ

عبد اللہ بن ابی اوفیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسن بن علی کے کان میں، جب کہ وہ حضرت فاطمہ کے ہاں تولد پذیر ہوئے تھے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ابو داؤد، جلد دوم، باب فی المولود یؤذن فی اذنہ) نماز کی اذان جیسی اذان دیتے دیکھا ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد، اور آپؐ کا یہ عمل محض ایک مذہبی رسم کے طور پر نہیں تھا، نہ صرف برائے برکت تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد کارفرما تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان بچہ کا اولین جزو تو ٔ حیات جب وجود میں آئے تو غیر محسوس طور پر خدا شناسی کا جوہر لیے ہوئے آئے، اور اس کے والدین کی توجہ الی اللہ ان کی ذہنی اور جذباتی لہروں کے ذریعہ اُس کے اندر بھی سرایت کر جائے۔ اور پھر جب وہ اس دنیا میں قدم رکھے تو اس کے اندرونی حواس کی گہرائی اور اس کا لاشعور سب سے پہلے جس چیز کو اپنے اندر جذب کرے وہ اسلام کی روح ہو، اس کے کانوں سے گذر کر اس کے ذہن کی تہوں میں جس حقیقت کا احساس اُترے وہ اللہ تعالیٰ کی لاشریک کبریائی کا، اس کے رسولؐ کی رسالت کا، اور اس کی بندگی کے اولین و کامل ترین مظہر (نماز) کا احساس و تصور ہو۔

جس اعلیٰ مقصد کی فکر کا اتنی دور سے اہتمام شروع ہو گیا ہو، ممکن نہیں کہ بعد کے مراحل میں اس کی طرف سے بے اعتنائی یا کم اعتنائی کو راہ دی جا سکی ہوگی۔ اس بے نظیر مقصد پسندی کا عین فطری تقاضا تھا کہ بچہ جوں جوں ایک باشعور ہستی کی حیثیت اختیار کرتا جائے اس کے قلب و نظر میں مقصد کے ابتدائی اور غیر شعوری احساس کو ہر ممکن تدبیر سے برابر جلا دی جاتی رہے، اور اس پر اسلام و خدا پرستی کا رنگ چڑھاتے رہنے میں کسی کوتاہی سے کام نہ لیا جائے۔ چنانچہ ٹھیک ایسا ہی کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنْ اِسْمَهُ وَاَدَبَهُ۔ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۷۱)

جس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو اسے چاہیے کہ اس کا کوئی اچھا سا نام رکھے، اور پھر اسے 'ادب' سکھاتے رہو۔

مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ (ترمذی، جلد دوم، باب ما جاء فی ادب الولد)

کوئی باپ اپنی اولاد کو حسنِ ادب سے بہتر کوئی چیز عطا نہیں کرتا۔

ان ارشادات میں 'تادیب' اور 'حسنِ تادیب' کے جو الفاظ ہیں، یاد رکھیے کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانیت کے ہادیٔ اعظم اور نفوسِ انسانی کے مزکّی بے عدیل کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور امتِ مسلمہ کے افراد کو سامنے رکھ کر فرمائے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا مدعا عام قسم کی 'تادیب' اور حسنِ تادیب کے مفہوم سے مختلف، بہت مختلف ہے۔ یہ مدعا صحیح ترین اسلامی تعلیم و تربیت کا مدعا ہے۔ مقصود ارشاداتِ عالیہ کا یہ ہے کہ اپنی اولاد کو ایسے خیالات سے، ایسی عادات و اطوار سے، ایسے افکار سے عقائد سے، ایسے کردار سے اور ایسی سیرت سے آراستہ کرتے رہو جن سے امت مسلمہ کے افراد کو لازماً آراستہ ہونا چاہیے، اور اس طرح اسے ایک ایسے خاص قالب میں ڈھال دو جو ظاہر اور باطن ہر حیثیت سے 'مسلمان' ہو، اور کسی پہلو سے بھی مسلمان کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ یہ اسی حسنِ تادیب کا ایک نمایاں جزء تھا جو اس حکم رسول میں مذکور ہے:۔

عَلِّمُوا الصَّبِيَّ الصَّلٰوةَ ابْنَ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُ عَلَيْهَا ابْنَ عَشْرَةٍ۔ (ترمذی جلد اول، باب ماجاء متی یومر الصبی بالصلوٰۃ)

بچہ جب سات برس کا ہو جائے تو اسے نماز سکھاؤ، اور جب وہ دس برس کا ہو جائے (اور پھر بھی نماز نہ پڑھے) تو اسے سزا دو۔

نماز ہی جیسی بات روزے کی بھی ہے۔ ہدایت ہے کہ بچوں کو روزہ رکھنے کی ترغیب دی جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دیگر احکام شریعت کی طرح نماز اور روزے کے احکام بھی بلوغ کے وقت ہی فرض ہوتے ہیں، اس سے پہلے کوئی بھی ان کا مکلف اور عند اللہ مسئول نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اگر مذکورہ ہدایات مسلمانوں کو دی گئی ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان ہدایات کی غایت وہی 'حسنِ تادیب' ہے جس کا ہر مسلمان کو اپنی اولاد کے سلسلے میں ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

بظاہر اولاد کی اس تعلیم و تربیت کے سلسلے میں باپ کی ذمہ داری اس وقت اختتام کو پہنچ جانی چاہیے جب وہ جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے، اور اب اسے سنِ رشد کو پہنچ کر اپنی اصلاح و تربیت کا خود ذمہ دار قرار دیا جانا چاہیے۔ لیکن عملی حقیقت چونکہ یہ نہیں ہے کہ ہر جوانی لازماً رشد و صلاح اور احساسِ فرض ساتھ لیے آتی ہو۔ اس لیے ایسی اولاد کے باپ کو بالغ ہونے کے باوجود اپنے مسلمان ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حق سے عملاً ناآشنا یا کم آشنا ہو، اس ذمہ داری کے بوجھ سے اب بھی سبک دوش نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ کیونکہ باپ کی حیثیت سے نہ سہی، ایک عام مومن کی حیثیت سے اُن کی اُس تیسری ذمہ داری کے تحت تو وہ بہر حال اب بھی آتی ہی ہے، اور آتی ہی رہے گی جو معاشرے کی اصلاح، اور اسے معروف کی تلقین اور منکر کی روک تھام کے سلسلے میں اس پر عائد ہے۔ اگر کوئی صاحبِ ایمان اس فریضے سے غافل نہیں ہے، اور خلقِ خدا کو بھلائی اور تقویٰ سے بہرہ ور کرتے رہنا اور برائی اور خدا فراموشی سے باز رکھنے کی جد وجہد کرنا وہ اپنی دینی اور ایمانی ذمہ داری سمجھتا ہے، تو بالکل فطری بات ہے کہ اس سلسلے میں اس کی نگاہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اپنے عزیز تر قریب کے لوگوں، بالخصوص اپنی اولاد ہی پر پڑے گی، اور پڑتی رہے گی۔ کیونکہ یہ امر، اور یہ نہی، کسی معمولی مقصد کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ، اپنے امکان کی حد تک انھیں آخرت کی ناکامیوں سے بچانے کے لیے ہوتی ہے۔ اور کوئی غلط کار سے غلط کار آدمی بھی ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ دنیا جہان کو تو اس عظیم ہلاکت سے بچا لینے کے لیے جان فشانیاں کرے، مگر خود اپنے قریب ترین عزیزوں کے متعلق بے فکر بنا رہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ انھیں بھی بس عام سطح پر رکھے۔ انسانی فطرت اس عجیب و غریب 'مساوات' کی کبھی روادار نہیں ہو سکتی۔ معاملے کے اس پہلو کو اگر سامنے رکھیے تو اس حقیقت کے سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اولاد کا سنِ رُشد اور اس کا وقتِ بلوغ آ جانا بھی، اس کا دورِ کہولت بھی اس کے مسلمان باپ کو اس کی تادیبِ حسن، اس کی اصلاح اور اس کی تلقینِ خیر کی ذمہ داریوں سے، اگر ضرورت باقی ہو، کو بری الذمہ نہیں قرار دلا دے سکتا، بلکہ بعض حالات میں تو، جب کہ اولاد کی غلط روی [illegible] ہی ہو، اس کی تلقین و تادیب اور افہام و تفہیم کا فریضہ اس کے باپ کا ایک دائمی فریضہ بن جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کا اسوہ

اس بارے میں [illegible] کے مثالی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نمونوں، انبیاء علیہم السلام کا اسوہ امر مطلوب کو پوری طرح روشن کر دیتا ہے۔ یہ حضرات اپنی اولاد کو جس بات کی نصیحت اور تاکید کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے وہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتی کہ بچو! اپنے خدا ہی کے ہو کے رہنا۔ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی، اور ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

.... وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (بقرہ - ۱۳۲)

.... اور اسی ملت (اور طریقے پر قائم رہنے) کی تاکید ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو، اور پھر یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کی تھی۔ (انھوں نے کہا تھا) کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین (اسلام) پسند فرمایا ہے، سو تم ہرگز نہ مرنا مگر (اسی) اسلام کی حالت پر۔

"سو تم ہرگز نہ مرنا مگر (اسی) اسلام کی حالت پر" کے فقرے کا زور و تاکید دیکھنے کے قابل ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کا بے نظیر مظہر بھی ہے۔ اور اس میں دینی حقائق و معانی کی پوری دنیا بھی سمٹی ہوئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا بھی، اور حضرت یعقوب کا بھی، مدعا یہ فرمانے سے یہ تھا کہ بیٹو! مسلم ہی بن کر جینا اور مسلم ہی کی حیثیت میں اس دنیا سے رخصت ہونا۔ تمہاری زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہ گذرنے پائے جب تم اپنے خداوند کے حضور اپنے پورے وجود کو سپرد کیے ہوئے نہ ہو۔ جب اس کی رضا کی طلب پر تمہاری نگاہ جمی ہوئی نہ ہو، جب اس کی اطاعت گذاری کے لیے تم سراپا چشم و گوش نہ بنے ہوئے ہو۔ یاد رکھو اس راہ میں بہت سی مزاحمتیں پیش آئیں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود تمہارا اپنا نفس اس خود سپردگی میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگے، مگر خبردار! ان مزاحمتوں اور ان اکتاہٹوں کے آگے کبھی ہتھیار نہ ڈالنا۔ تمہیں ہر طرح کے حالات میں اپنے آقا و مولا سے چمٹے رہنا چاہیے۔ تم اللہ کے دین کے امین ہو اور اس کی کامل اور غیر مشروط بندگی ہی تمہاری زندگی کا پہلا اور آخری فریضہ ہے۔ اس لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جینا تو اسی کے لیے، اور مرنا تو اسی کے لیے گذاری کی حالت میں۔

پھر بات اتنی ہی نہیں ہے کہ انبیاء کرام اپنی اولاد کو یہ وصیت صرف انہیں روائی زندگی ہی میں کرتے رہے ہوں، نہیں، اس کی ضرورت انھیں اس وقت بھی یاد رہتی، اور اس فکر کا غلبہ ان کے ذہن پر اس لمحہ بھی برقرار رہتا جو ان کی حیاتِ دنیوی کا آخری وقت اور آخری لمحہ ہوتا۔ مثال کے طور پر، خود قرآن کریم کی شہادت کے مطابق حضرت یعقوبؑ جب وقتِ آخرت کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے تو انھیں اپنے فرزندوں کے بارے میں اس کے سوا اور کوئی فکر اور دوسری کوئی آرزو نہیں تھی کہ وہ ان کے بعد بھی اللہ کی لاشریک بندگی کے راستے پر پوری یکسوئی اور استقامت کے ساتھ چلتے رہیں۔
چنانچہ انھوں نے اسی غرض کی خاطر ان سے سوال کے انداز میں فرمایا:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ (بقرہ۔ ۱۳۳) تم لوگ میرے بعد کس کی بندگی کروگے۔

یہ سوال کا انداز انھوں نے اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ بات بیٹوں کے سامنے زیادہ موثر طریقے سے آسکے اور انھیں اس امر کی اچھی طرح تنبیہ ہو جائے کہ حق اور اتباعِ حق کے معاملے میں کم اعتنائی اور کم کوشی کو کبھی قریب نہ آنے دیں گے۔ آنجنابؑ کی اس وصیت اور اس تاکید و تنبیہہ سے ایک طرف تو اپنی اولاد کی حقیقی بہی خواہی کا، دوسری طرف دین کی بے نظیر محبت اور فکرمندی کا، تیسری طرف اپنے فرض کی ادائی کے غیر معمولی احساس کا جو اظہار ہوتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا۔ آخر وہ اس امر واقعی سے ناواقف تو نہیں تھے کہ جنھیں وہ خطاب فرما رہے ہیں وہ ان کی اپنی ہی اولاد ہیں، پیغمبر زادے ہیں، ایک خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ ہیں، رسالت کی چھاؤں میں پلے بڑھے ہیں، اور خود ان کی اپنی ہی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھے ہیں۔ ایسے بندگانِ خاص کے بارے میں یقین کی حد تک توقع اسی بات کی رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کبھی اپنے مقام و منصب کو نہ بھولیں گے اور اللہ کے دین اور اس کی رضا کے لیے ہی جینا مرنا ان کا شعار ہوگا، مگر پیغمبر کی شدتِ فکر و شدتِ احتیاط دیکھیے کہ وہ ان سب باتوں کے باوجود دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی ان کے جذبۂ عبودیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور احساس دین و ایمان کو نہایت موثر اور مرغوب صورت انداز میں مہمیز کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اور جب سعادت مند بیٹے پوری عابدانہ شان اور پورے مومنانہ عزم کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ:-

نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (بقرہ-۱۳۳)	ہم (آپ کے بعد بھی بدستور) آپ (ہی) کے معبود اور آپ کے بزرگوں، ابراہیم اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کرتے رہیں گے جو تنہا معبود برحق ہے، اور اسی کے طاعت گذار رہیں گے۔

تب جا کر وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

اور امر واقعی کی آخری حد یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ جس پیغمبر کے کوئی اولاد نہ ہوتی جس سے وہ اپنے بعد اپنے مشن کی علمبرداری کی توقعات وابستہ رکھ سکتا، وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا کہ اسے ایسی کوئی اولاد عطا فرما دی جائے۔ حضرت زکریاؑ اس کی واضح مثال ہیں۔ وہ لاولد تھے۔ جب عمر کی اس حد تک پہنچ گئے جہاں پہنچ جانے کے بعد عام قانونِ طبیعی کے تحت اولاد کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی تو یہ دیکھ کر مضطرب ہو اٹھے کہ دین کی جو خدمت انجام دیتے رہے ہیں مستقبل میں اس کے برقرار رہنے کے امکانات بڑی حد تک تاریک ہیں۔ اُن کا تعلق اُس اسرائیلی قبیلے (بنی لاوی بن یعقوب) سے تھا جو بارہ قبیلوں پر مشتمل پوری اسرائیلی قوم میں سے مقدس کی خدمت اور دین کی نگہداشت کے لیے مخصوص تھا، اور اس قبیلے کی بھی شاخ 'بنی ہارون' اس خدمت کے سب سے اعلیٰ کاموں کے لیے خاص تھی۔ حضرت زکریا اسی شاخ کے ایک خاندان (بنی ابیاہ) کے سردار تھے، اور اس لیے مقدس کی خدمتِ خاص کے منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ان کی زندگی کی شام آ چکی ہے اور حال یہ ہے کہ نہ صرف بنی ابیاہ میں بلکہ پورے قبیلۂ بنی لاوی میں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس خدمت کا اہل ہو تو ان پر سخت حزن کی کیفیت طاری ہو گئی، اور پھر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے چینی کے عالم میں اپنے خدا کے حضور میں التجا پھیلا کر عرض پرداز ہوئے کہ:

رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا۔ (مریم، ۴-۶)

اے میرے مالک! میری ہڈیاں گھل چکی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ مالک! میں کبھی تجھ سے مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں (کی فرض ناشناسی) کا ڈر ہے، اور میری بیوی بانجھ ہے۔ سو اپنی عنایت خاص سے مجھے ایک وارث عطا کر دے جو میری وراثت کو سنبھالے اور آلِ یعقوب کا بھی وارث بنے، اور اے پروردگار اسے پسندیدہ انسان بنا۔

یقینی طور پر ان کی یہ درخواست کسی دنیوی وارث عطا کیے جانے کی درخواست نہیں تھی۔ کیونکہ اس درخواست کے الفاظ ایسا سمجھنے کی بالکل اجازت نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ایسا خیال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ "ہمارا (یعنی اللہ کے پیغمبروں کا) کوئی وارث نہیں ہوا کرتا، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقۂ عام ہوا کرتا ہے" (لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ) (بخاری، جلد دوم، کتاب الفرائض) پس حضرت زکریا کی یہ درخواست واضح طور پر ایک دینی وارث کی درخواست تھی، جو ان کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے مشن کی خدمت اور علم برداری کا کام دے سکے ان کا یہ کہنا کہ "مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں کی فرض ناشناسیوں کا ڈر ہے"، اس حقیقت کا ناطق گواہ ہے کہ انھیں اپنے خاندان میں، جو مقدس کی خدمات بجا لانے کا اصل ذمہ دار تھا، دور دور تک ایسا کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا جو اس فرض کو ادا کر سکتا اور اخلاقی اور دینی نقطۂ نگاہ سے اس عظیم اور مقدس منصب کا اہل ہوتا۔ اس لیے انھوں نے اپنے لیے جس وارث کی دعا کی تھی وہ ایک ایسا وارث تھا جو ان کی اور خانوادۂ یعقوب کی عملی صلاحیتوں اور دینی کارگزاریوں کا صحیح معنوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں وارث ثابت ہو سکتا۔

سچے اہلِ ایمان نے اسوۂ انبیاء سے کیا رہنمائی حاصل کی

یہ انبیاء علیہم السلام کا اپنا صرف ایک عمل نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے اس عمل سے اپنے پیروؤں اور بعد کے اہلِ ایمان کے لیے ایک بنیادی اہمیت کی سنت بھی چھوڑی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کا یہ اسوہ اندر یہ تلقین رکھتا ہے کہ ہر مومن و مسلم کو اپنی اولاد کے بارے میں یہی روش اختیار کرنا چاہیے۔ اس کو اصل فکر، اصل تمنا اور اصل کوشش اس بات کی رکھنی چاہیے کہ اس کے بچے اور کچھ نہ بن سکیں نہ سہی، مگر اپنے خدا کے سچے بندے ضرور بنیں۔ اسی کی وہ انھیں اچھی سے اچھی نصیحتیں اور موثر سے موثر وصیتیں کرتا رہے اور اسی چیز کو وہ ان کے لیے اپنا چھوڑا ہوا سب سے قیمتی ترکہ سمجھے۔ کیونکہ انسان کی اصل زندگی دنیا کی نہیں بلکہ آخرت کی زندگی ہے، اور اسی کی کامیابی اصل کامیابی، اور اسی کی ناکامی اصل ناکامی ہے۔ اس لیے ایک مخلص اور دور اندیش مسلمان کو اپنی اولاد کی تربیت اور ذہن سازی بھی اسی نہج کی کرنی چاہیے کہ وہ اپنی توجہات کا حقیقی رخ آخرت ہی کی طرف رکھنے والا بن جائے۔ رہا دنیا کی ضرورتوں کا سوال تو ان کے لیے ہر شخص کی طبیعت میں خود ایک زبردست داعیہ موجود ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ آپ سے آپ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے، اور کرنے کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے جب کہ آخرت کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ایک طرف تو وہی اصل زندگی ہے، دوسری طرف اس زندگی کے لیے زادِ راہ مہیا کرنے اور کرتے رہنے کے لیے اس کی طبیعت میں کوئی محرک نہیں پایا جاتا۔ اس طبیعت کے محرکات تمام تر لذت نوازی ہوتے ہیں۔ اور ان میں بلا کی طاقت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے آدمی ان کا اثر قبول کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اولاد کو دنیا کی ضرورتوں کے لیے کچھ سکھایا پڑھایا ہی نہ جائے۔ ضرور سکھایا پڑھایا جائے۔ لیکن ان کا وہی مقام رکھا جائے جس کی وہ مستحق ہیں۔ مقدم کام کو مقدم اور موخر کو موخر ہی رکھا جائے۔ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقدم کام ایک مسلمان کے لیے آخرت کا کام ہے، دنیا کا نہیں۔ اس کے لیے ایسی ذہنیت ایک لعنت ہے جو اسے یہ یاد ہی نہ آنے دے کہ وہ حیوان نہیں بلکہ انسان ہے، وہ اس دنیا میں تن پروری اور عیش کوشی کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اپنے پیدا کرنے والے کی بندگی اور رضا طلبی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے خود شناسی اور خدا طلبی کی جو سنتیں چھوڑی ہیں، اور جن کی تعلیم دی ہے، وہ تمام و کمال اسی مقصد کی خاطر تھیں۔ ان کے سچے متبعین نے اس مقصد کو جس طرح یاد رکھا اور ان کی سنت پر جس طرح عمل کیا، اس کا مثالی نمونہ حضرت مریم کی والدہ ماجدہ کے عمل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت مریم ابھی ان کے بطن پاک ہی میں تھیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ۔ (آل عمران - ۳۵)

اے میرے رب! میں نے اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کیا کہ وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف رہے، میری اس پیشکش کو قبول فرمالے۔

اس دعا میں اگرچہ یہ صراحت نہیں ہے کہ انھوں نے دعا ایک بیٹے کے عطا کیے جانے کی تھی بلکہ امر واقعہ یہی ہے، جس کا ثبوت بعد کے فقروں سے تو ملتا ہی ہے خود اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اپنے ہونے والے بچے کو اللہ ہی کے کام کے لیے وقف کرنے کی نذر کر رہی تھیں، اور شریعت موسوی میں اللہ کے کام، یعنی مقدس کی خدمت کے لیے مرد ہی مقرر کیے جا سکتے تھے، اور یہ منصب انہی کے لیے مخصوص تھا، عورتیں اس خدمت پر مامور نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے حضرت مریم کی والدہ کا یہ کہنا کہ یہ بچہ مُحَرَّر (یعنی مقدس کی خدمت کے لیے وقف) ہوگا، قطعاً یہی معنی رکھتا تھا کہ خدایا! مجھے بیٹا عنایت فرما۔ یہ قریب قریب وہی بات تھی جو حضرت زکریا کی دعا میں تھی۔ یعنی اس درخواست کے وقت ان کی نظر اپنی کسی دنیوی ضرورت اور مصلحت کی طرف بالکل نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہرگز نہیں تھی کہ انھوں نے بیٹے کی آرزو کچھ اس طرح کی غرض سے کی ہو جس طرح کی غرض سے عام لوگوں کی ہوا کرتی ہے کہ بیٹا زندگی کا سہارا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بڑھاپے کا عصا بنے گا۔ اس کے بجائے انھوں نے خدا سے بیٹا خود اس دین کی خاطر مانگا تھا، صرف اس غرض سے مانگا تھا کہ اس کے ذریعہ مقدس کی خدمت انجام پائے، اللہ کے دین کو فروغ حاصل ہو اور دنیا میں حق کا اجالا پھیلے۔ ان کی اس پاک آرزو ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں جب بیٹے کی بجائے بیٹی پیدا ہوگئی تو اس پر وہ صرف اظہارِ حسرت ہی پر بس کر کے خاموش نہیں ہوگئیں بلکہ اب اسی پر صابر و شاکر ہو کر اسی بچی ہی کے لیے اس کے مومنہ صادقہ ثابت ہونے کی دعا کی طرف متوجہ ہوگئیں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض پیرا ہو کر بولیں کہ "میں نے اس کا نام مریم (پارسا اور پاک دامن) رکھا ہے، اور اسے اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دے رہی ہوں" (وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ آل عمران۔ ۳۶) اس گزارش کا مدعا جس طرح واضح ہے اسی طرح اس کے پیچھے کام کرنے والا جذبہ بھی واضح ہی ہے۔ مدعا یہ تھا کہ اس بچہ کی زندگی، اور صرف اس کی اپنی ہی زندگی نہیں، بلکہ اس کی آل اولاد کی زندگی بھی پاکیزگی کا نمونہ بنے اور شیطان کی دراندازیوں سے محفوظ رہے۔ یہ سب کے سب خدا کے سچے پرستار ہوں، ان کے ایمان و عمل کی باگیں نفس، دنیا اور شیطان کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں، تقویٰ اور طہارت ان کا شعار ہو، اور اللہ رب العالمین کی طاعت اور رضا طلبی ان کا وظیفۂ حیات ہو۔

حضرت مریم کی والدہ ماجدہ کا یہ طرزِ عمل یہ بتا دینے کے لیے بالکل کافی ہے کہ خدا اور اس کا دین ایک مسلمان سے اس کی اپنی اولاد کے بارے میں فی الواقع کیا چاہتا ہے؟ اس کے حق میں اس کی اصل ذمہ داری کس بات کو قرار دیتا ہے؟ وہ اس کو کیا بنانے کی ہدایت دیتا ہے؟ کون سا ذہن اور اندازِ فکر اس کے اندر پیدا کرنے کو کہتا ہے؟ کیسی تربیت دینے کی تاکید کرتا ہے؟ اور کس 'علم' کا 'ماہر' بنانے کی تلقین کرتا ہے؟

اہلِ ایمان کا ایک لازمی وصف

اولاد کے باب میں ایک مسلمان کا یہی بنیادی فریضہ ہے جس کی بنا پر قرآن حکیم نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

'عباد الرحمٰن' (رحمان کے بندوں) کی ایک ضروری پہچان اور لازمی صفت یہ بتائی ہے کہ:

يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔ (الفرقان۔ ۷۴)

وہ کہتے ہیں کہ مالک! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

اس آیت کا اصل مدعا سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تصریحات سامنے ضرور رکھنی چاہییں: ایک تو یہ کہ مومن کی آنکھوں کی اصل ٹھنڈک وہ باطنی کیف اور روحانی سرور ہے جو اسے نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ (احمد، نسائی)

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

دوسری یہ کہ ہر فرد مسلم اپنے زیر اقتدار اور زیر اثر لوگوں اور چیزوں کا نگہراں اور ذمہ دار ہوتا ہے:

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْأَمِيرُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ ... الخ۔

(مسلم جلد دوم، کتاب الامارۃ)

سن رکھو تم میں کا ہر شخص راعی (نگہراں و ذمہ دار) ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ لوگوں کے اوپر مقرر ہونے والا حکمراں ان کا راعی اور ذمہ دار ہے، اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی، اور مرد اپنے اہل و عیال کا راعی ہے، اور ان کی بابت اسے (اپنے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہوگی، ... الخ۔

ان ارشادات نبوی کی روشنی میں آیت کریمہ کا مدعا و مفہوم صاف طور سے یہ قرار پاتا ہے کہ 'عباد الرحمٰن' وہ لوگ ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں سچے مسلمان وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے زیر کفالت و زیر اثر اہل و عیال کو اس حال میں پانا اور دیکھنا چاہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

'عباد الرحمن' (رحمان کے بندوں) کی ایک ضروری پہچان اور لازمی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ:

يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ لَّنَا وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔ (الفرقان۔۷۴)	وہ کہتے ہیں کہ مالک! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

اس آیت کا اصل مدعا سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تصریحات سامنے ضرور رکھنی چاہییں: ایک تو یہ کہ مومن کی آنکھوں کی اصل ٹھنڈک وہ باطنی کیف اور روحانی سرور ہے جو اسے نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ (احمد، نسائی)	میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

دوسری یہ کہ ہر فرد مسلم اپنے زیر اقتدار اور زیر اثر لوگوں اور چیزوں کا نگراں اور ذمہ دار ہوتا ہے:

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْأَمِيرُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ ۔ ۔ ۔ الخ۔ (مسلم جلد دوم، کتاب الامارۃ)	سن رکھو تم میں کا ہر شخص راعی (نگراں و ذمہ دار) ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ لوگوں کے اوپر مقرر ہونے والا حکمراں ان کا راعی اور ذمہ دار ہے، اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی، اور مرد اپنے اہل وعیال کا راعی ہے، اور ان کی بابت اسے (اپنے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہوگی، ۔ ۔ ۔ الخ۔

ان ارشادات نبوی کی روشنی میں آیت کریمہ کا مدعا و مفہوم صاف طور سے یہ قرار پاتا ہے کہ 'عباد الرحمن' وہ لوگ ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں سچے مسلمان وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے زیر کفالت و زیر اثر اہل و عیال کو اس حال میں پانا اور دیکھنا چاہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہیں جسے دیکھ کر ان کے دلوں کو کچھ ویسی ہی راحت محسوس ہو جو ایک مومن کو نماز سے ملا کرتی ہے، نہ کہ وہ جھوٹی ٹھنڈک، جو دنیا کی متاعِ بے ثبات سے اہلِ دنیا کو حاصل ہوا کرتی ہے۔

اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ افراد، جن کا وہ 'راعی' اور 'امام' ہے، تقویٰ کی صفت سے متصف ہوں، جن کے عقائد، جن کے افکار، جن کا نقطۂ نظر، جن کا کردار، جن کی گفتار، جن کی سیرت، جن کا اخلاق، جن کی پسند، جن کا مطلوب اور مقصود وہ ہو جو ان کے معبودِ برحق کی نگاہ میں پسندیدہ ہو، جس سے وہ خوش ہوتا ہو، اور جس کی اس نے ہدایت فرما رکھی ہو۔ ایسے ہی اہل و عیال اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتے ہیں، اور اسی شکل میں وہ 'متقیوں کا امام' ٹھہر سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

اس وصف کی عملی شکل

اب تک کی بحث سے جو یہ اصولی حقیقت واضح ہوئی ہے کہ انبیاء اور ان کے سچے پیروؤں کی، اپنی اولاد کے بارے میں، اصل فکر کس بات کی رہتی ہے، اس کی عملی شکل اگر معلوم کرنی ہو تو قرآن کریم کی طرف رجوع کیجیے، جو آپ کو بتائے گا کہ لقمان نامی ایک سچے خدا پرست مومن و مسلم نے اپنے اس فریضے اور ذمہ داری کو ذرا تفصیل سے ادا کرنا چاہا تو اپنے بیٹے کو یوں نصیحت کی تھی:۔

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ..... يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمٰوٰتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ۔ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ

بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو (خدائی میں) شریک نہ کرنا، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے .... بیٹا! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر کا بھی ہو، پھر وہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں کہیں چھپا ہوا ہو، تب بھی اللہ اسے نکال لائے گا، وہ بڑا باریک بین اور (ہر شے سے پوری طرح) باخبر ہے۔ بیٹا! نماز قائم رکھنا (لوگوں کو) نیکی کا امر کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ وَاقْصِدْ فِىْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (لقمان - ۱۳ - ۱۹)

اور برائی سے روکتے رہنا، اور (اس راہ میں) جو مصیبت بھی تجھ پر پڑے اس پر صبر کرنا، بلاشبہ یہ بڑا عزیمت طلب کام ہے، اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کرنا نہ زمین پر اتراتے ہوئے چلنا۔ اللہ کسی خود پسند اور شیخی باز کو پسند نہیں کرتا، اپنی چال میں اعتدال ملحوظ رکھنا، اور اپنی آواز کو ذرا پست رکھنا۔ یقین جانو کہ سب آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔

یہ حضرتِ لقمان بھی اُسی سنہری سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو اپنے اہل و عیال کی صحیح ترین ذہن سازی اور تعلیم و تربیت کا مثالی نمونہ قائم کرتا رہا ہے، اس لیے اُن کی یہ نصیحت اور یہ تقریر، جو انھوں نے اپنے عزیز بیٹے کو مخاطب کرکے کی تھی، اللہ تعالیٰ کی اُس 'عبادت' اور دین کی 'اس خدمت' کی ایک مستند وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے جس کی ہدایت اور وصیت حضرات انبیاء کرام اور ان کے راست بازپیرو اپنی اولاد کو کرتے چلے آرہے ہیں، اور جس کا ہر صاحبِ ایمان مکلّف ہے۔ یہ تقریر جن بنیادی امور پر مشتمل ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی توحید پر گہرا اور واضح ایمان، (۲) آخرت کی جواب دہی کا سچا یقین (۳) نماز کی، جو دراصل پوری شریعت کا مغز و محور ہے، اقامت (۴) بندگانِ خدا کو معروف کی تلقین کرتے رہنا اور منکرات سے دور رکھنے کی جدوجہد دوسرے لفظوں میں حق کی شہادت اور دینِ خدا کی اقامت (۵) دین و ایمان کی راہ میں، بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نتیجے میں پیش آنے والی مشکلوں، مخالفتوں، تکلیفوں اور نقصانوں پر صبر و استقامت (۶) تواضع اور انکسار (۷) سنجیدگی اور وقار۔

غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ 'عبادت' اور 'دین کی خدمت' کے یہ بنیادی امور پورے مجموعۂ دین و شریعت کو محیط ہیں، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں بنیادی ایمانیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ہیں، بنیادی[2] عبادت (نماز) بھی ہے، حق کی شہادت[3] اور دین کی اقامت کا فریضہ بھی ہے، اور بنیادی مکارمِ[4] اخلاق بھی ہیں۔ دین کے احکام و شرائع کا کوئی جزو ایسا نہیں ہوسکتا جو براہ راست یا بالواسطہ، ان بنیادوں چیزوں کے اندر ضم جاتا ہو۔ اس لیے حضرت لقمان کی اس نصیحت اور وصیت کا کھلا ہوا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی ہر ہدایت کی تعمیل کی جائے۔ جو مسلمان بھی اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کا حق ادا کرنا چاہے — اور اگر وہ مسلمان ہے تو اسے لازماً ایسا کرنا ہی چاہیے — اس کے لیے، ان توضیحات کے بعد بھی کوئی بات مبہم یا مجمل نہیں رہ جاتی۔ اسے واضح طور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نوع کی تعلیم و تربیت ہے؟ اس کے لیے اصل فکر کس بات کی رکھنی، اور اصل کوشش کس امر کی کرنی چاہیے؟ اور اس 'فکر' اور اس 'کوشش' کی عملی شکل کیا ہے؟

آخرت میں باز پُرس

آخر میں اِس جانی جاچکی اہم حقیقت کو مزید نمایاں کر دینا مناسب، بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے بارے میں مسلمان باپ کی یہ فکر اور یہ کوشش صرف ایک مستحسن کام اور ایک اخلاقی فضیلت کی بات نہیں ہے، حتیٰ کہ یہ صرف ایک ایمانی وصف بھی نہیں ہے، بلکہ ایسا ایمانی وصف ہے جس کی حیثیت ایک عظیم ذمہ داری اور ایک لازمی فریضے کی ہے، اور اس کے بارے میں اسے اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ آپ ابھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن چکے ہیں کہ "تم میں سے ہر شخص اپنے اہل و عیال کا 'راعی' اور نگراں و ذمہ دار ہی نہیں ہے بلکہ "ھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ" (وہ اپنی رعیت کے تئیں خدا کے حضور میں مسئول اور جواب دہ بھی ہے) یہ مسئولیت اور یہ جواب دہی جو معنی رکھتی ہے اور خدا کی عدالت میں کی جانے والی یہ باز پُرس جتنی سخت اور پریشان کن ہو سکتی ہے، اس کا تصور ایک حساس مسلمان کو ہلا کر رکھ دینے والا ہے، جس کے بعد وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انجام کیا ہو سکتا ہے؟ پہلے سوال کا جواب اسلام کی ابتدائی تاریخ بڑی صراحت سے دے چکی ہے، اور دوسرے کا جواب بعد کی صدیوں کی تاریخ میں موجود ہے، اور سب سے واضح جواب اِدھر آخری دور کی اس تاریخ کی زبان سے سن لیا جا سکتا ہے جس میں ملتِ اسلامیہ پر مغرب کے استعمار ہی کا نہیں، اس کے تہذیبی افکار کا بھی زبردست غلبہ رہا ہے۔ اب اس کے سیاسی تسلط کی گرفت چاہے جتنی بھی ڈھیلی پڑ چکی ہو، لیکن جہاں تک اس کے فکری اور اقداری غلبہ و تسلط کا تعلق ہے، اس سے ملت کا جاں بر ہونا اب بھی مشکل بنا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اِکا دُکا افراد ہی اپنی اس ذمہ داری کو فراموش کیے بیٹھے ہوں تب بھی بحیثیت مجموعی ملت کے حال و مستقبل پر اس کا کوئی ناگوار اثر مرتب نہیں ہو سکتا، لیکن خدانخواستہ یہ وبا عام ہو گئی ہو تو اسے ملت کی اسلامیت کے لیے اجل کا پیغام ہی کہا جا سکتا ہے۔ آج صورتِ واقعہ کیا ہے، اس کا جائزہ لینا ہر مسلمان کا فرض ہے، اور خاص طور سے ان مسلمانوں کا تو "فرضِ عین" ہے جو کسی بچے یا کچھ بچوں کے باپ ہوں اور جن کی امانت میں مشیت نے دین و ملت کے نونہال دے رکھے ہوں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظوں میں یہ کہ جو کسی 'اہلِ بیت' کے 'راعی' بنائے جا چکے ہوں۔

فارم ۱۷

رسالہ "تحقیقات اسلامی" علی گڑھ

۱۔ مقام اشاعت : علی گڑھ

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳۔ نام پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

۴۔ نام اور پتہ مالک رسالہ : ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی، دودھ پور، علیگڑھ

میں سید جلال الدین عمری تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں

دستخط :-
سید جلال الدین عمری
۱۸ر فروری ۱۹۸۲ء

© rasailojaraid.com